سرسیّد پر کُفر کا ایک اور فتویٰ

جناب محمد مجتبیٰ صدیقی صاحب سابق رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سرسید احمد خاں نے ۱۸۷۵ء میں جب مسلمانوں کو انگریزی علوم کی تعلیم دینے کے لئے علی گڑھ میں ایک مدرسے کی بنیاد ڈالی، جو بعد میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا، تو علاوہ اُن کے چند گِنے چنے ساتھیوں کے مسلمانوں نے اُن سے اس بنا پر سخت اختلاف کیا کہ ایسی تعلیم پاکر مسلمان مذہب سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ یہ اختلاف اس حد تک بڑھا کہ سرسیّد کو بدنام کرنے کا کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا۔ اُن کے خلاف کفر کا فتویٰ تک صادر کیا گیا جو مسلمانوں کے اسلحہ خانے میں سب سے موثر ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ حرم سے بھی کفر کے فتوے منگوائے گئے اور اُن کی دِل کھول کر اشاعت کی گئی۔ لیکن ان تمام مخالفتوں کے باوجود سرسیّد کے پائے استقلال میں لغزش نہیں ہوئی اور جس کام کو اُنھوں نے شروع کیا تھا اس کو پورا کر دکھایا۔ چنانچہ آج جب کہ تعصب کے بادل چھنٹ گئے ہیں اُنھیں سرسید کو مسلمان سر آنکھوں پر بٹھاتے اور اپنا بہترین خیرخواہ گردانتے ہیں۔

کُفر سازی کا یہ دور مدت ہوئی ختم ہو چکا لیکن اب دوبارہ اس کا آغاز ایک نئی شکل میں ہوا ہے۔ پہلے سرسید اس لئے کافر قرار دئے گئے تھے کہ وہ مسلمانوں کو انگریزی کی تعلیم دینا چاہتے تھے۔ اور اب اس لئے کہ لڑکیوں کے لئے وہ جس تعلیم کے حامی تھے لڑکیوں کے لئے اسی کے مخالف تھے!

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

اس خیال کا اظہار چند مہینے ہوئے ویمنس کالج میں لڑکیوں کے اسکول کے بانی شیخ عبداللہ کی صد سالہ یومِ پیدائش کی تقریب کے موقع پر کیا گیا۔ شیخ عبداللہ کی ان انتھک کوششوں کو جو انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کیں جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ وہ کافر کے لقب سے تو نہیں نوازے گئے لیکن مخالفت اُن کی بھی ہر ممکن طریقہ سے کی گئی۔ مگر یہ سرسید کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ انھیں کی طرح انھوں نے بھی مخالفت کی ذرہ برابر پروا نہ کرتے ہوئے اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔ اُن کا قایم کیا ہوا پرائمری اسکول پہلے ہائی اسکول ہوا، پھر انٹرمیڈیٹ کالج اور آخر میں ترقی کرکے ڈگری کالج بن گیا۔ چنانچہ اس صد سالہ تقریب میں بانی مدرسہ کی ہر ممکن ستائش کی گئی۔ کہیں کہیں تو یہ تعریف مبالغہ کے حدود میں داخل ہو گئی۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی گرلز اسکول کے صدی نمبر میں جو اس تقریب کے موقع پر شایع ہوا ہے شیخ عبداللہ کے ہم عصر طلبا، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈپٹی حبیب اللہ اور مولانا طفیل احمد کے متعلق پروفیسر بشیرالدین لکھتے ہیں:

"ان میں کسی میں بابا میاں کی سی دور رسی، صبر اور استقلال اور جرأتِ رندانہ نہیں تھی جو کسی اہم مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ضروری عناصر مانے گئے ہیں"۔

پروفیسر بشیرالدین کی یہ رائے حقیقت سے بہت دور ہے۔ لیکن اگر بفرضِ محال صحیح بھی ہے تو کیا جن لوگوں نے اپنی زندگیاں اس درس گاہ کے لئے وقف کر دی تھیں، جو اسی کے لئے جیتے تھے اور اپنی آخری سانس تک اس کی خدمت میں لگے رہے، اُن کی اس طرح تنقیص شیخ عبداللہ کی برتری ثابت کرنے کے لئے ضروری تھی؟

اس صد سالہ تقریب کی صدارت یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر بدرالدین طیب جی صاحب نے کی۔ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں جہاں شیخ عبداللہ کی جی بھر کے تعریف کی جس کے وہ بلا شبہ مستحق تھے وہاں ایک چھینٹا سرسید پر بھی ڈال دیا، بلکہ شایدان پر برس پڑے۔ میں سرسید کا جتنا معتقد ہوں طیب جی صاحب کا بھی اتنا ہی معترف ہوں، مگر مجھے

سرسید پر اُن کے اس اعتراض سے تعجب ہوا۔ میں کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں، پھر ایسی جگہ (ایک لفظی تحریف کے لئے حضرت میر تقی میر سے معذرت کے ساتھ)

رہتے ہوں منتخب ہی جہاں روزگار کے

زبان کھولنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوتی۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ اس تقریب کو مہینوں گذر گئے مگر کفر کے اس نئے فتوے کے خلاف کہیں سے آواز بلند نہیں ہوئی تو مجھے خیال ہوا کہ شاید قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

اور سرسید کی حمایت میں قلم اُٹھانے کی سعادت میرے ہی نصیب میں لکھی گئی ہے۔ اسی خیال سے یہ چند سطور لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

اس بحث میں سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ تعلیم نسواں کے متعلق سرسید نے کیا کہا اور کن حالات میں کہا۔ جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں سرسید نے تعلیم نسواں کی بابت اپنے خیالات کا علانیہ اظہار صرف ایک دفعہ اس ایڈریس کے جواب میں کیا تھا جو ۱۸۸۴ء میں خواتین پنجاب نے گورداسپور میں اُن کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اسی جواب کو طیب جی صاحب نے بھی اپنے اعتراض کی تائید میں پیش کیا ہے لیکن اس جواب میں انھوں نے ایک ایسا عیب بھی نکال دیا ہے جس کا سرے سے کہیں وجود ہی نہیں ہے۔ طیب جی صاحب کہتے ہیں:

"سرسید نے مسلمان عورتوں کو یہ تلقین کی کہ اُن کی دادیاں اور نانیاں جن رسوم و رواج کی پابند تھیں اُن سے نہ صرف یہ کہ سرمُو انحراف نہ کیا جائے بلکہ اس طریقۂ تعلیم اور نصاب کو بھی بدستور قایم رکھا جائے جس کی یہ معزز خواتین پابند تھیں۔"

مروجہ طریقۂ تعلیم اور نصاب قایم رکھنے کی صلاح تو سرسید نے ضرور دی مگر رسم و رواج کا تو انھوں نے بھولے سے کہیں نام بھی نہیں لیا۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا وہ بات اُن کو بہت ناگوار گذری ہے

جو بھی اس الزام کو سُنے گا خواہ مخواہ سرسید سے بدظن ہوگا کہ یہ بھی اچھے مُصلح قوم تھے کہ بھلے بڑے

سب ہی رسوم و رواج کی پابندی پر زور دیتے تھے! ہاں اگر کنایتہً اپنی پرانی ریت پر چلنے کی تلقین کہیں ہے تو ان الفاظ میں ہے:

"تمہارا فرض تھا کہ تم اپنے ایمان اور اسلام سے واقف ہو۔ اس کی نیکی اور خدا کی عبادت کی خوبی کو تم جانو۔ اخلاق میں نیکی۔ نیک دلی۔ رحمت و محبت کی قدر سمجھو اور ان سب باتوں کو اپنے برتاؤ میں لاؤ . . . . خدا پرستی، خدا ترسی، اپنے ہمسایوں کے ساتھ ہمدردی، اپنا طریقہ رکھو . . . . . ."

اس تلقین پر چاہے اسے رسم و رواج کی پابندی ہی سمجھ لیجئے، کوئی کس طرح حرف لاسکتا ہے!

اب میں سر سید کے جواب سے چند اقتباسات جو اس بحث سے متعلق ہیں پیش کروں گا۔ جواب تو بہت طویل ہے۔

"میں اپنی قوم کی خاتونوں کی تعلیم سے بے پروا نہیں ہوں۔ میں دل سے اُن کی ترقی تعلیم کا خواہاں ہوں . . . . . تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت درست ہو گئی ہو۔ اور کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں ہے جس میں مردوں کی حالت درست ہو گئی ہو اور عورتوں کی حالت درست نہ ہوئی ہو . . . . میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے . . . . جو خدمت میں اس وقت کر رہا ہوں وہ نہ صرف تمہارے لڑکوں ہی کی ہے بلکہ تمہاری لڑکیوں کی بھی ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو اس سے دونوں برابر فائدہ اٹھائیں گے اور لڑکے اور لڑکیاں دونوں علم کی روشنی سے روشن ضمیر ہوں گے۔"

اس اقتباس کو آپ پڑھ کر کسی طرح سے بھی اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ سر سید لڑکیوں کی تعلیم کو لڑکوں کی تعلیم سے کم اہم سمجھتے تھے؟ اس کا خط کشیدہ حصہ خاص طور سے توجہ کے قابل ہے۔ اگر سر سید کے ذہن میں تعلیم کا جو نقشہ تھا اس میں عورتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی تو اُن کا یہ کہنا کہ ان کی اس خدمت سے "لڑکے اور لڑکیاں دونوں برابر فائدہ اُٹھائیں گے اور دونوں علم کی روشنی سے روشن ضمیر ہوں گے۔"

کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس کے بعد بھی اگر، جیساکہ طیب جی صاحب کا خیال ہے، یہ سمجھا جائے کہ "سرسید عورتوں کو اسلامی تعلیم و تہذیب اور نئے علوم کا امتزاج جو برگ و بار لانے والا تھا اس سے محروم رکھنا چاہتے تھے" تو یہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان کا یہ خیال کتنا حکیمانہ تھا کہ کسی قوم میں مردوں کی حالت درست ہوئے بغیر عورتوں کی حالت درست نہیں ہوتی۔ اور اگر مردوں کی حالت درست ہو جائے تو عورتوں کی حالت درست ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لڑکیوں کی "تعلیم کی جڑ" تو وہ بٹھا ہی رہے تھے۔ اس سے جو پودا نکلتا اس کا پروان چڑھنا وہ کس طرح روک سکتے تھے۔ سوال اُن کے سامنے صرف تقدیم و تاخیر کا تھا نہ کہ اس کا کہ عورتیں تعلیم کی برکتوں سے بالکل محروم کر دی جائیں۔

طیب جی صاحب کہتے ہیں کہ سرسید مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کو ایک واحد مسئلہ کی صورت میں دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ البتہ وہ اس کے قائل نہیں تھے کہ ایک نئے طریقۂ تعلیم کو بروئے کار لانے میں جس سے قوم بالکل آشنا نہیں تھی مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی چوٹی پکڑ کر گھسیٹا جائے، چاہے اس کے نتیجہ میں کسی کا بھلا نہ ہو۔ وہ کوئی ناتجربہ کار نوجوان نہیں تھے کہ ابھی ایک محاذ پر تو کامیابی ہوئی نہیں تھی، لڑکیوں کی انگریزی تعلیم کا مسئلہ چھیڑ کر ایک محاذ اور قائم کر دیتے۔ برسوں پرانے خیالات وہ دنوں میں تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کی دُور بیں نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اُن کی تحریک کی کامیابی کا راز مسلمانوں کے ایک تدریجی ذہنی ارتقا میں مُضمر تھا۔ اگر فوری طور سے وہ لڑکیوں کی انگریزی تعلیم کے لئے تیار نہیں ہوتے تو اُس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ اگر انھوں نے اس کا نام بھی لیا تو لڑکیوں کا بھلا تو کیا ہوگا لڑکوں کی ناؤ بھی ڈوب جائے گی۔ اُن کا یہ خیال صحیح تھا کہ مردوں کی تعلیم کے بعد عورتوں کی تعلیم کا راستہ خود ہموار ہو جائے گا۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ایسا ہی ہوا۔ البتہ اس کا سہرا شیخ عبداللہ کے سر بندھنا تھا سو بندھا۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی داغ بیل سرسید ہی کی دور اندیشی کی مرہونِ منت ہے۔

عورتوں کے طریقہ تعلیم میں فوری تبدیلی سرسید ایک اور وجہ سے غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس کو انھیں کے الفاظ میں سُنیئے :

"مردوں کو جو تمھارے لئے روٹی کما کر لانے والے ہیں زمانہ کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم، یا کوئی سی زبان سیکھنے (یہاں اشارہ انگریزی علوم اور انگریزی زبان کی طرف ہے) اور کسی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آئی ہو مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم کے متعلق تم کو پہلے تھی اس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی"

آج سے سو برس پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ مستقبل میں نظریات اتنے بدل جائیں گے کہ عورتوں کا مردوں کے لئے روٹی کما کر لانا ممکنات میں ہو جائے گا !

ایک وجہ اور بھی تھی جس نے سرسید کو اس مسئلہ میں احتیاط سے قدم اٹھانے پر مجبور کیا۔ وہ اگر ایک طرف انگریزی علوم کی تعلیم کے قائل تھے تو دوسری طرف مسلمان بچوں اور بچیوں کو اسلام کا پابند بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ آج کل کے ترقی پسند دانشوروں کی پیشانیوں پر شاید یہ سُن کر شکنیں پڑ جائیں لیکن واقعہ یہی ہے کہ جس طرح اسلام نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو حصولِ علم کی تاکید کی ہے اسی طرح اُن کے اسلام پر ثابت قدم رہنے پر بھی زور دیا ہے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ملک میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ جاہ و ثروت ختم ہو چکی تھی۔ بھلا یا بُرا ایک مذہب ہی تھا جس کو وہ سینوں سے لگائے ہوئے تھے۔ لیکن آخر کب تک ایسا کر سکتے تھے؟ حکومت کی نظروں میں اُن کے ساتھ ہر نا انصافی انصاف تھی۔ اس کی حمایت کے بَل بُوتے پر عیسائی مشنری مسلمانوں کو مذہب سے متنفر کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ گورداسپور کے جلسے سر سید نے لودھیانہ میں طلبا کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا :

"یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے اس کو قایم رکھنے سے ہماری قوم قوم ہے۔ اے عزیز بچے، اگر کوئی آسمان کا تارا ہو جاوے مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا۔ وہ تو ہماری قوم ہی میں نہ رہا۔ پس اسلام کو قایم رکھ کر ترقی کرنا قومی بہبودی ہے۔ اُمید

ہے کہ تم ہمیشہ اس کو قایم رکھو گے اور اس کے ساتھ تمام باتوں میں ترقی کرتے جاؤ گے کہ یہی قومی ترقی ہوگی "

اس تقریر میں زور کس بات پر دیا گیا ہے ؟ تاکید کس بات کی ہے ؟ یہی کہ پہلے مسلمان بنو اور پھر اُس کے ساتھ ترقی کرو ۔

سید اقبال علی جو سر سید کے دورۂ پنجاب میں اُن کے ہمراہ تھے اُن کی تمام تقریروں کو ضبطِ تحریر میں لاتے جاتے تھے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" جس وقت سید صاحب یہ تقریر کرتے تھے مجھے تعجب ہوا تھا کہ انھوں نے اس طرز سے کیوں تقریر کی ۔ بعد کو مجھے خیال آیا کہ سید صاحب کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ (طلبا) لدھیانہ کے مشن اسکول میں تعلیم پاتے ہیں ۔ اس خیال پر سید صاحب نے اس طرز پر گفتگو کی "

گویا سر سید نے تاڑ لیا تھا کہ دشمن کمین گاہوں میں چھپا ہوا ہے اور وقت کا منتظر ہے کہ حکومت کی حمایت سے مسلمانوں کو اُن کے مذہب سے برگشتہ کرنے کا جو نادر موقع اُس کو ہاتھ آیا ہے کب اُس سے فائدہ اُٹھائے ۔ تو جب سر سید کو لڑکوں کے متعلق یہ خطرہ تھا تو وہ اُس کو ایک دوسرے راستے سے لڑکیوں تک پہنچ جانے کا موقع کس طرح دے دیتے ؟ پردے کا اُس وقت جس سختی سے رواج تھا اُس کو دیکھتے ہوئے لڑکیوں کو اسکول بھیجنا تو کسی کے خیال میں آ نہیں سکتا تھا ۔ پھر اس وقت اسکول تھے بھی کہاں ۔ اس لئے لڑکیوں کو انگریزی تعلیم دلانے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ مشن کی عورتوں کو شریف گھرانوں میں باریابی دی جاتی اور اس طرح مشنریوں کو اپنی ریشہ دوانیوں کے لئے کھلی چھوٹ مل جاتی ۔

خواتینِ پنجاب کے ایڈریس کا سر سید نے جو جواب دیا اس کی کچھ تشریح سید اقبال علی نے ان الفاظ میں کی ہے :

" ہم لوگ لاہور پہنچنے بھی نہیں پائے تھے ہم نے دیکھا کہ سید صاحب کا جواب نہایت خوشخط اور عمدہ کاغذ اور خوش تقطیع پر چھپ گیا ہے اور گھر گھر اس کی کاپیاں تقسیم ہو رہی ہیں ۔ لودھیانہ کے اخبار " نور افشاں " نے جو پادریوں کا اخبار ہے (اس کے نام ہی سے ظاہر ہے

کہ اس کی پالیسی دینِ عیسوی کی تبلیغ تھی، اس پر بہت نکتہ چینی کی ہے اور اس جواب سے ناراض معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کا ناراض ہونا اور نکتہ چینی کرنا بجا بھی ہے کیونکہ سید صاحب کے جواب سے مشنریوں کی وہ تمام امیدیں جو وہ مستورات کی نسبت اپنی کارروائیوں سے رکھتے تھے برباد ہوتی معلوم ہوتی ہیں"

ان حالات میں سرسید کی دینی حمیت کس طرح گوارا کر سکتی تھی کہ معصوم بچیوں پر، جن کو اُن کی بے علمی کی وجہ سے رام کر لینا نسبتاً زیادہ آسان تھا، مشنریوں کا جادو چل جانے دیتے؟ مجھے یقین ہے کہ اگر طیب جی صاحب نے لودھیانہ اور گورداسپور کے جلسوں کی مکمل روداد پر نظر ڈالی ہوتی تو وہ سرسید کے جواب کو اس معنی میں "ایک متحیر کن دستاویز" نہ کہتے جس میں انھوں نے کہا ہے بلکہ تحیر اُن کو سرسید کی نظرِ بالغ اور زبانِ ہوشمند پر ہوتا کہ کس طرح مسئلہ کے موافق و مخالف دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوئے اُنھوں نے ایک اُٹھنے والے فتنہ کا مکمل سدِّ باب کر دیا۔

شیخ عبداللہ نے "مشاہدات و تاثرات"، کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے ایم۔ اے۔ او کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ اِس میں انھوں نے متعدد جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ سرسید عورتوں کی جدید تعلیم کے خلاف تھے۔ مثلاً "سرسید احمد خاں جیسے قوم کے رہنما نے بھی جدید تعلیم نسواں کی مخالفت کی" (صفحہ ۱۹۸) "سرسید جدید تعلیم لڑکیوں کے لئے قطعی طور پر مناسب نہیں سمجھتے تھے" (صفحہ ۲۰۵)۔ وغیرہ۔ یہ خیال اُن کے دل میں ایسا جاگزیں ہو گیا تھا کہ انھوں نے اس کی بنا پر سرسید کو قدامت پرست اور رواج پرست ہی نہیں ٹھہرایا بلکہ مذہبی احکام سے انحراف کرنے کا الزام بھی ان پر لگا دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"سرسید نے رواج پرستی اور قدامت پرستی کے غلبہ کی وجہ سے جو اُن کے خیالات پر تھا لڑکیوں کی تعلیم کے معاملے میں مذہبی احکام کو بھی پسِ پشت ڈال دیا" (صفحہ ۴۰)

مگر اس کے فوراً بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ سرسید:

"مجھ سے بدرجہا زیادہ مذہبی احکام سے واقف تھے ...... انھوں نے بھی پڑھا ہوگا جیسا کہ میں نے بھی پڑھا ہے کہ ہمارے پاک مذہب کا یہ حکم تھا کہ ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت کے لئے علم کا سیکھنا فرض کیا گیا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید کا مذہبی مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ اس بات سے لاعلم نہیں ہو سکتے تھے کہ ہماری عورتیں طلوعِ اسلام کے تین سو برس کے اندر ہی دینی علوم میں اتنی مہارت حاصل کر چکی تھیں کہ تفسیر و حدیث کے درس بھی دیتی تھیں۔ طیب جی صاحب نے یہ صحیح لکھا ہے کہ سرسید اپنے زمانے سے پہلے پیدا ہوئے تھے۔ شیخ عبداللہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "سرسید مصلح تھے اور عام انسانوں کے اخلاق کی درستی انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا تھا۔" پھر یہ کس طرح باور کر لیا جائے کہ ایسے روشن ضمیر شخص پر صرف ایک لڑکیوں کی تعلیم کے مسئلہ میں قدامت پسندی کا اس قدر غلبہ ہو جائے گا کہ وہ مذہبی احکام کو بھی پسِ پشت ڈال دے گا۔

میری دانست میں شیخ عبداللہ یہاں ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ نہ تو اُن کے پاس سرسید کا ایسا تجربہ تھا اور نہ وہ اُن کی طرح دور اندیش تھے۔ شیخ عبداللہ نوجوان تھے اور سمجھتے تھے کہ بس عورتوں کی جدید تعلیم کا جھنڈا بلند کر دو۔ کامیابی خود بڑھ کر قدم چومے گی۔ سرسید جانتے تھے کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے اس لئے خاموش تھے۔ اس خاموشی کو شیخ عبداللہ نے سرسید کی قدامت پسندی پر محمول کر لیا۔ "مشاہدات و تاثرات" میں شیخ عبداللہ خود لکھتے ہیں (صفحہ ۲۰۰) کہ عورتیں "اس زمانے میں اگر جدید تعلیم کا نام بھی لیتیں تو مرد اُن کی زبان کاٹ لیتے۔" نواب محسن الملک کو جو سرسید کے سب سے بڑے معتمد کار تھے وہ شروع ہی سے عورتوں کی جدید تعلیم کا حامی سمجھتے رہے۔ نواب صاحب ہی کی تحریک سے ۱۸۹۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں شعبۂ تعلیمِ نسواں قائم ہوا۔ لیکن انھیں کے دو واقعے شیخ عبداللہ نے ایسے لکھے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورتوں کی جدید تعلیم کی علانیہ حمایت کس طرح لڑکوں کی تعلیم کے لئے سنگِ راہ ثابت ہوتی۔ ۱۹۰۵ء کی کانفرنس میں عورتوں نے بھی حصہ لینا چاہا اور اُن کے علیحدہ اجلاس کے لئے شیخ عبداللہ کی درخواست پر نواب محسن الملک

نے کالج کی ایک پُرانی عمارت دے دی۔ مگر مقامی مسلمانوں کے دباؤ ڈالنے سے یہ اجازت اُن کو منسوخ کرنی پڑی۔ دوسرا واقعہ اس سے چند مہینے پہلے کا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں کوئی کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ اس کانفرنس سے چند دن پہلے بھوپال سے لڑکیوں کے مدرسے کے لئے سو روپیہ ماہوار کی امداد مقرر ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کے کسی جلسہ میں شیخ عبداللہ نے نواب محسن الملک سے اس امداد کا ذکر کیا۔ نواب صاحب نے اس کو سُنتے ہی اپنی ٹوپی صحن میں پھینک دی۔ بعد میں جب شیخ عبداللہ نے اُن سے اس خفگی کا سبب دریافت کیا تو وہ مسکرائے اور فرمایا "تم اپنا کام کئے جاؤ میں نے اپنا کام کیا ہے۔ اس کی بہت ضرورت تھی کہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ میں کسی مدرسے کے قایم کرنے کا حامی نہیں ہوں"۔

اور یہ سب ہو رہا تھا ۱۸۸۲ء کے بیس برس بعد۔ اب اگر اس کے باوجود شیخ عبداللہ کو نواب محسن الملک سے حُسنِ ظن قایم رہتا ہے تو وہ سرسید کو اس سے کیوں محروم کرتے ہیں جنھوں نے ۱۸۸۲ء میں علی الاعلان کہہ دیا تھا کہ وہ دل سے عورتوں کی ترقی تعلیم کے خواہاں ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے اس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی وجہ یہی تھی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ جلدبازی میں سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے اور مسلمان اس پُرانی مثل کے مصداق بن جائیں:

آدھی کو چھوڑ ساری کو دھاوے آدھی رہے نہ ساری پاوے

یہ روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ آدمی جب خود اپنی سوانح عمری لکھنے بیٹھتا ہے تو اپنے خیالات اور اپنی رائے کو دانستہ یا نادانستہ دوسروں کے مقابلے میں بہتر سمجھ کر ظاہر کرتا ہے۔ "مشاہدات و تاثرات" اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اکثر واقعات جن کے متعلق تاریخ کی شہادت کچھ اور کہتی ہے شیخ عبداللہ نے بالکل دوسرے رنگ میں پیش کئے ہیں۔ وہ تحریکِ خلافت کے بہت زیادہ خلاف معلوم ہوتے ہیں، مگر اس مخالفت میں وہ یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ترک سلاطین میں صرف سلطان عبدالحمید نے جن کی حکومت پچھلی صدی کے آخر اور اس صدی کے شروع میں تھی اپنی سیاسی ضرورتوں سے مجبور ہوکر خلافت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس دعوے کی پذیرائی ہندوستان میں تو خوب ہوئی مگر اور کسی اسلامی ملک نے ترکوں کو خلیفہ نہیں مانا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ المتوکل عباسی

نے آج سے قریب پانچ سو برس پہلے منصب خلافت سلطان سلیم کے حق میں منتقل کر دیا تھا۔ اس وقت ترکی کا شمار دنیا کی عظیم طاقتوں میں تھا۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ جنگ بلقان کے موقع پر ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں جو طبی وفد ترکی گیا تھا اس نے ترکوں کو کوئی طبی امداد نہیں پہنچائی بلکہ یونہی واپس چلا آیا۔ یہ ڈاکٹر انصاری کے اوپر ایک صریح بہتان ہے۔ کامریڈ کی فائلیں جس نے پڑھی ہیں وہ جانتا ہے کہ وفد نے کس جانسوزی سے ترکی جنگی زخمیوں کی خدمت کی تھی۔

ایک اور امر قابلِ لحاظ یہ ہے کہ شیخ عبداللہ نے جب اپنے "مشاہدات و تاثرات" قلمبند کرائے اس وقت اُن کی عمر قریب ۷۵ سال کے پہونچ چکی تھی جب حافظہ جواب دینا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا اعتراف خود انھوں نے اِن الفاظ میں کیا ہے :

"میں جو کچھ لکھوں گا وہ اپنے حافظہ کے اعتبار پر لکھوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میرا حافظہ مجھے دھوکا نہیں دے گا اور جس قدر واقعات قلمبند ہوں گے اُن میں غلطی کا امکان بہت ہی کم ہوگا۔"

توجب واقعات میں اتنی بڑی بڑی غلطیاں ہوگئی ہیں تو تاثرات تو بھر تاثرات ہی ہیں۔ ان میں اس سے بھی بڑی غلطیوں کے ہو جانے کا امکان ہے۔ اس لئے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ ہم شیخ عبداللہ کے اس خیال سے اتفاق کرلیں کہ سرسید عورتوں کے لئے جدید تعلیم مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ البتہ یہ سوال بالکل جداگانہ ہے کہ جس انگریزی تعلیم سے بے قیدی پیدا ہوتی ہے اسے سرسید مناسب سمجھتے تھے یا نہیں۔ اس کی بابتہ کچھ اشارہ اُن کی ۱۸۸۸ء کی تقریر میں ہے۔ گو بہت واضح نہیں ہے۔ آخر کوئی بات تو ہے جس نے علامہ اقبال کے ایسے عظیم مفکر کی زبان سے یہ دو شعر کہلوا دیئے:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی　　قوم نے دیکھ لی فلاح کی راہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین　　پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

علامہ اقبال کے متعلق تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ قدامت پرستی کی لعنت میں گرفتار تھے! مشرق نے ان کے ایسے روشن ضمیر کم پیدا کئے ہیں۔

شیخ عبداللہ کے تاثرات کے متعلق میں نے جو خیال ظاہر کیا ہے اس سے اگر کسی غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان ہو تو میں ایک دفعہ پھر اُن کے عورتوں میں جدید تعلیم کو رواج دینے کے عظیم کارنامے کا اعتراف کروں گا۔ کسی نے اُن کو سرسید ثانی کہا ہے۔ پروفیسر ہادی حسن کے الفاظ میں اُن کو "عبداللہ اول" کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

سرسید کے متعلق میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ فرشتہ تھے۔ یقیناً وہ انسان تھے اور غلطی بھی کر سکتے تھے لیکن جس شخص نے اپنی زندگی کی ایک ربع صدی کا ایک ایک لمحہ اپنی قوم کی فلاح و بہبود کی فکر میں صرف کیا ہو اس کو اتنا تو حق ہے کہ ہم سے اپنے متعلق کچھ حسن ظن کی اُمید رکھے۔ ہر دانش گاہ کے لئے کوئی بلند ہستی آئیڈیل کا درجہ رکھتی ہے۔ جس طرح دیوبند کے لئے مولانا محمدؒ قاسم نانوتوی اور ندوہ کے لئے علامہ شبلی آئیڈیل ہیں اسی طرح علی گڑھ کے لئے سرسید آئیڈیل ہیں اُن پر اعتراض کرنا ہمارے لئے سوء ادب ہے۔ ہمارے مقتدر اسلاف جو آج سے ۱۰۰ - ۱۵۰ برس پہلے ایک بالکل مختلف ماحول میں ہو گذرے ہیں اُن کو اپنے معیار سے جانچنا کہاں کی دانش مندی ہے۔ بقول عارف رومی :

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر

لیکن پھر بھی اگر کوئی اعتراض کرنا ہی چاہے تو اس سے ہم یہ گذارش کریں گے کہ ٹھیک ہے کہ سرسید نے غلطی کی۔ مگر یہ کیا ضرور ہے کہ سو برس بعد اب اس کا ڈھنڈورا پیٹا جائے اور دنیا پر یہ ظاہر کر دیا جائے کہ مسلمان احسان فراموشی میں آپ اپنی نظیر ہے۔ اللہ تعالیٰ جہاں اپنے بندوں کے اَن گنت قصور معاف کر دیتا ہے آپ سرسید کا ایک ہی گناہ بخش دیجئے۔

لیکن معترض کے تنقیدی جذبے کو اگر اب بھی تسکین نہ ہو تو ہم سعدیؒ کا یہ شعر عرض کریں گے :

اے کہ آگاہ نۂ ای عالمِ درویشاں را
تو چہ دانی کہ چہ سودا و سر است ایشاں را